ڈاکٹر طٰہٰ حسینؒ !

رشید احمد جالندھری

جن لوگوں نے جدید مصر کی ادبی، ثقافتی اور اجتماعی زندگی کا مطالعہ کیا ہے وہ جانتے ہیں کہ ڈاکٹر موصوف کی عظیم شخصیت نے جدید مصر کی تعمیر و تشکیل میں ایک زبردست کردار ادا کیا ہے، آپ مسلم تاریخ کی ان چند ممتاز شخصیتوں میں سے ایک ہیں، جنہوں نے تلاشِ حق کی راہ میں اپنی بے سروسامانی اور بے چارگی کو حائل ہونے نہیں دیا اور اپنی سعیٔ پیہم سے معاشرے کی بے جان ادبی، ثقافتی اور اخلاقی قدروں میں نئی روح پھونکی۔

ڈاکٹر طٰہٰ حسین نے آج سے تقریباً ۸۴ سال قبل مصر کی ایک غریب بستی کے ایک غریب خاندان میں آنکھیں کھولیں۔ اس دور میں مادی وسائل کا فقدان کیا کم ظلم تھا کہ فطرت نے آپ کو ایک نئی آزمائش کے سامنے لا کھڑا کیا اور وہ تھی آنکھوں سے محرومی۔

ذرا ہوش سنبھالا تو والدین نے مذہبی تعلیم کے لئے قاہرہ کی ہزار سالہ پرانی درس گاہ ازہر میں بھجوا دیا، جہاں پر قرآن، حدیث، ادب اور منطق کی تعلیم کے ساتھ ساتھ طالب علموں کے قیام اور خورد و نوش کا بھی انتظام کیا جاتا تھا۔ آپ ازہر میں تقریباً ۸ سال رہے اور اس زمانے میں مصر کی نئی یونیورسٹی قاہرہ یونیورسٹی میں جانا شروع کر دیا، جس کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ ازہر کی تعلیم اور اس کا ماحول تلاشِ حق کی راہ میں آپ کی فطری جستجو کا جواب نہ دے سکا۔ اس پر مزید ستم یہ ہوا کہ ازہر کے بعض تنگ نظر استادوں نے آپ کو ایک نابینا، دیہاتی اور غریب و ناتواں طالب علم جانا اور وہ سلوک کیا جو اخلاقِ فاضلہ سے عاری آدمیوں کا شعار ہوا کرتا ہے، اس بھیانک سلوک کی دردناک داستان آپ کی

⁜ یہ مضمون ادھر ۱۲ سال پہلے لندن کے ایک انگریزی رسالے کے لئے لکھا گیا تھا۔

کتاب "الایام" میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ازہر سے نکل کر آپ نے قاہرہ یونیورسٹی میں داخلہ لے لیا، جہاں پر آپ نے کامیابی کے ساتھ اپنی تعلیم مکمل کی اور عربی کے مشہور شاعر و فلسفی ابو العلا معرّی پر ڈاکٹریٹ حاصل کی۔ اب وقت کا مزاج بدل چکا تھا، اب وہ آپ کا مذاق اڑانے کی بجائے آپ کے ساتھ ساتھ چل رہا تھا۔ قاہرہ سے آپ فرانس چلے گئے۔ فرانس سے واپس ہوئے تو قاہرہ یونیورسٹی میں یونانی تاریخ کے استاد مقرر ہوئے۔ پھر ایک مدت کے بعد عربی ادب کے استاذ بن گئے، پھر اسی کالج کے پرنسپل بن گئے، اور پھر وہ وقت بھی آیا جب آپ نے بحیثیت وزارت میں تعلیم کی کرسی کو شرف بخشا، اور تعلیم کو پھیلانے اور اساتذہ کرام کے وقار کو بلند کرنے کے لئے بے پناہ کام کیا، مصر کے جدید دور میں آپ نے معزز شہری کی حیثیت سے زندگی بسر کی، نہ صرف مصر یا عرب دنیا بلکہ پوری ادبی دنیا میں عزت و احترام کی نگاہوں سے دیکھے گئے اور جب کبھی اپنے مخصوص لہجے میں سیاست سے الگ رہ کر حالات کا تجزیہ کیا اور مارشل لاء کی حکومت کو انسانی فکر اور حریت رائے کے لئے نقصان دہ قرار دیا تو اسے ناصر جیسے مقتدر اور مضبوط حکمران نے بھی خاموشی سے سنا اور جب ۱۹۷۵ء میں ایک بھرپور علمی و ادبی زندگی کے بعد دنیا سے رخصت ہوئے تو نہ صرف عرب دنیا بلکہ پوری دنیا کی دانش گاہوں میں سوگ منایا گیا۔

اخلاق و اطوار

متوسط قد، گندمی رنگ، پرکشش چہرہ، اشک آلود نگاہیں، جن پر ہر وقت سیاہ چشموں کا پردہ پڑا رہتا تھا، شیریں و جادو بھری آواز، خوش پوش، انتہائی ذہین و فطین اور غیر معمولی حساس، حق جو اور حق گو، عربی کے علاوہ یونانی، لاطینی اور فرانسیسی زبانوں پر کامل عبور، انتہائی شریف، تقلید سے نفرت، لیکن معری سے عقیدت۔

تخلیقی کارنامے

ڈاکٹر موصوف نے اپنی پہلی کتاب "الشعر الجاھلی" کے نام سے شائع کی، جس میں آپ نے دورِ

جاہلیت سے منسوب شاعری سے انکار کر دیا۔ اس کتاب کا شائع ہونا تھا کہ مصر کے قدامت پسند گروہ میں ایک کہرام مچ گیا۔ ازہر کی ایک مذہبی کمیٹی نے آپ کی کتاب کا جائزہ لیا۔ اور یہ فیصلہ صادر کیا کہ طہٰ حسین کی یہ کتاب مذہبی اور اسلامی نقطۂ نظر سے نذر آتش کی مستحق ہے۔ یہ ہنگامہ اسی پر ختم نہیں ہوا بلکہ آپ کو قاہرہ یونیورسٹی سے الگ کئے جانے کا بھی مطالبہ کیا گیا۔ مصری اسمبلی میں جس کے اجلاس مصر کے قوم پرور رہنما سعد زاغلول کی صدارت میں منعقد ہوئے۔ آپ کی کتاب پر بڑے زور کی بحث ہوئی۔ بعض ممبروں نے آپ پر بڑے سخت حملے بھی کئے۔ آپ کی ذات یا کتاب کے خلاف جو کچھ لکھا گیا یا اسمبلی میں کہا گیا، اس کی ایک جھلک "تحت رایۃ القرآن" میں دیکھی جا سکتی ہے، جو آپ کے حریف مصطفیٰ الرافعی کے قلم سے ہے۔

آپ نے اپنی کتاب میں لکھا تھا:۔

"مصر کی ادبی ثقافتی زندگی پر جمود و تقلید کا پہرا ہے، جو لوگ اس کے اجارہ دار ہیں وہ ادب کی ابجد سے ناآشنا ہیں۔ یہ لوگ گزشتہ نصف صدی میں ایک کتاب تک لکھ نہیں پائے، ان میں سے ایک آدمی بھی ایسا نہیں جس نے فرانسیسی و انگریزی ادب تو کجا، یونانی و فارسی ادب کا ایک لفظ بھی پڑھا ہو۔" (الادب الجاہلی)

ڈاکٹر موصوف نے جب تقلید و جمود کے بتوں کو توڑنا شروع کیا تو آپ پر اسلام دشمنی کے آوازے کسے گئے۔ آپ کو مستشرقین کا شاگرد قرار دیا گیا۔ حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ آپ نے تقلید و جمود کے ساتھ ساتھ مستشرقین کی گمراہی و جہالت کا بھی مذاق اڑایا۔

آپ نے لکھا:۔

"بعض مستشرقین نے امیہ بن صلت کی شاعری پر بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ وہ قرآن کا اصلی مآخذ ہے، لیکن مقامِ تعجب ہے کہ ان لوگوں نے قرآن کو محمدؐ کا کلام ثابت کرنے کے لئے تو امیہ بن صلت سے منسوب شاعری پر مکمل اعتماد کیا۔ لیکن سیرت و حدیث میں جو کچھ مروی ہے اس کی صحت پر ہمیشہ شک و شبہ میں مبتلا رہے۔" (الادب الجاہلی)

ڈاکٹر موصوف عہد حاضر میں شاید پہلے آدمی ہیں، جنہوں نے کھل کر یہ کہا کہ قرآن کی لغوی و

معنوی تشریح وتفسیر میں دورِ جاہلیت کی شاعری سے استشہاد کرنا ایک قلم غلط ہے، دورِ جاہلیت کی فکری، مذہبی، تجارتی اور اجتماعی زندگی کی صحیح تصویر قرآن کے صفحوں میں محفوظ ہے، دورِ جاہلیت سے منسوب شاعری میں نہیں۔ (الادب الجاہلی)

اس میں کوئی شک نہیں کہ طٰہٰ حسین، یونانی اور لاطینی ادب وثقافت سے بہت متاثر ہیں، انھوں نے پیرس سے وطن واپسی پر یونان کے سیاسی نظام پر ارسطو کی کتاب "نظام الاثنینین" کا عربی میں ترجمہ کیا اور ایک مفصل مقدمے میں ارسطو کے افکار وخیالات کا جائزہ لیا۔ اس کے بعد انھوں نے یونان اور روم کے بڑے بڑے فلسفیوں اور بادشاہوں پر ایک خوبصورت کتاب "قادة الفکر" لکھی، سقراط، افلاطون اور ارسطو کے خیالات کو جس خوبصورت انداز سے پیش کیا اس سے یونانی فلسفہ اپنی پوری رعنائیوں کے ساتھ انسانی ذہن کے سامنے بے نقاب ہو کر سامنے آگیا۔ کہا گیا کہ اس روانی اور صفائی سے تو ہمارے قدماء مثلاً قفطی اور ابن ابی اصیبعہ نے بھی اپنی معروف کتابوں "اخبار العلماء" اور "عیون الانباء" میں نہیں لکھا ۔۔۔ ۱۹۴۸ء میں پھر یونان گئے تو ایتھنز کے آثار قدیمہ میں جاکر ایسے کھوئے گئے کہ گرد وپیش کی خبر تک نہ رہی اور سقراط وافلاطون کے ساتھ گھنٹوں محفل آرائی میں مشغول رہے۔ طٰہٰ حسین کا یہ کہنا ہے کہ 'علم الاخلاق' پر سب سے پہلے اہلِ یونان نے لکھا۔

یونانی ادب وتاریخ سے اس گہرے تعلق کے باوجود طٰہٰ حسین کو اپنی شخصیت پر مکمل اعتماد رہا۔ یونانی اور لاطینی دنیا کی سیر کرنے کے بعد انھوں نے کہا کہ عربی ادب اپنی داخلی صلاحیتوں کی بناء پر اپنے اندر جو جوشِ حیات رکھتا ہے، اس کی بنیاد پر وہ قدیم دنیا کی چار معروف ومشہور ثقافتوں، فارسی، ہندوستانی' لاطینی اور یونانی میں اپنی امتیازی شان رکھتا ہے، عربی ادب نے کسی کے نقشِ قدم کی تلاش نہیں کی۔ اس کا موازنہ یونانی ادب سے تو کیا جاسکتا ہے، کیونکہ دونوں اپنی جدا جدا مستقل اور ممتاز شخصیات رکھتے ہیں، لیکن لاطینی ادب کا عربی ادب سے کیا مقابلہ کیونکہ پہلا (لاطینی ادب) مقلد ہے جب کہ دوسرا "مجتہد" طٰہٰ حسین نے عربی ادب کی حمایت میں جس پرشکوہ انداز سے لکھا اس نے ان لوگوں کے تمام دعوؤں کو باطل قرار دے دیا جو "مستقبل الثقافة فی مصر" میں طٰہٰ حسین کو "مغربیت" کا نقیب دیکھ رہے تھے۔

طٰہٰ حسین اپنے خیالات کی اشاعت میں چپ و راست کی طرف نظر اٹھائے اور قدامت پسند گروہ کی سخت مخالفت کی پرواہ کئے بغیر اپنی راہ پر چلتے رہے۔ آپ نے عربی شاعری پر "حدیث الاربعا" کے نام سے مقالے لکھے، ان مقالوں پر ازہر کے پرچے "نورالاسلام" میں تنقید کی گئی، جو زیادہ تر مذہبی قسم کی تنقید تھی۔ جس کا ایک نمونہ یہ ہے۔ "شیخ طٰہٰ کا حالیہ مقالہ (جس میں آپ نے لکھا تھا کہ جب حسان بن ثابت نے ابوسفیان کی بیوی ہندہ کی ہجو لکھی تو حضور نے فرمایا تھا کہ "روح القدس معک" جبریل تیرے ساتھ ہے۔) رسول کریمؐ کی حدیث "اذکروا محاسن موتاکم" کی روح کے خلاف ہے۔ میں اس قلم کی زبان سے محمدؐ اور آپ کے ساتھیوں کے ذکر پر چپ نہیں رہ سکتا جس سے کبھی ناپاک شعر بھی لکھے گئے ہیں۔" (نورالاسلام ۱۹۳۲ء)

ظاہر ہے کہ اس قسم کی مذہبی تنقید طٰہٰ حسین کے لئے ناقابل التفات تھی۔ طٰہٰ حسین کی پہلی کتاب پر جب بعض حلقوں نے آسمان سر پر اٹھا لیا تو طٰہٰ حسین نے قاہرہ یونیورسٹی کے وائس چانسلر جناب احمد لطفی کو ایک خط میں لکھا۔ "میں مسلمان ہوں، خدا، رسالت اور آسمانی کتابوں پر ایمان رکھتا ہوں، میں نے اپنی کتاب میں اسلام کے خلاف کچھ نہیں لکھا اور نہ ہی یہ بات میرے تصور میں آسکتی ہے۔"

طٰہٰ حسین کے اس مکتوب گرامی کو مکر و فریب سے تعبیر کیا گیا اور کہا گیا کہ ڈاکٹر نے اپنی پروفیسری بچانے کے لئے یہ خط لکھا ہے، لیکن وقت نے بتایا کہ طٰہٰ حسین واقعی اپنے قول و عمل میں مخلص ہیں۔ آپ نے رسول کریمؐ کی زندگی کا گہرا مطالعہ کیا تو آپ کا دل و دماغ رسالت مآبؐ کی محبت و عقیدت کے پاکیزہ جذبات سے لبریز ہوگیا اور "علی ھامش السیرۃ" کی صورت میں اُبل پڑا، یہ کتاب تین جلدوں میں ہے اس کے ایک ایک لفظ سے مصنف کے دل کی دھڑکنوں کی آواز سنائی دے رہی ہے۔ آپ نے روایتی اندازِ تالیف سے ہٹ کر فلسفۂ رسالتؐ پر جس انداز سے قلم اٹھایا ہے، اس سے پتہ چلتا ہے کہ بنی نوع انسان کے ضمیر و وجدان کے قرار و اطمینان کے لئے رسالت کیوں ضروری ہے۔

آپ کی زندگی کا ایک بڑا کارنامہ مصر کے مدارس، نصاب تعلیم اور اساتذہ کے پرانے سانچے کو بدلنا ہے۔ آپ نے یہ کام اپنے عہدِ وزارت میں کیا۔ مشرقی ملکوں میں اساتذہ کی، خاص طور پر پرائمری اور ہائی اسکولوں کے اساتذہ کی ماضی میں جو خستہ حالت رہی ہے وہ سب پر عیاں ہے۔ آپ نے ان اساتذہ کو ان کا صحیح مقام دلوایا۔ اس سلسلہ میں آپ نے استادوں کے ایک اجتماع کو خطاب کرتے ہوئے کہا:۔ خدا کی قسم!

اگر میرے بس میں ہو کر کسی معلّم کو مظلوم دیکھوں تو انصاف دلاؤں۔ پیچھے پاؤں تو آگے بڑھاؤں۔ طلب گار دیکھوں تو بامراد کروں، ناراض پاؤں تو مناؤں، تو میں اپنے آپ کو اس دنیا کا سب سے بڑا خوش انسان تصوّر کروں گا۔"

آپ نے اس اجتماع میں قوموں کے عروج و زوال کی داستان بیان کرتے ہوئے جو الفاظ کہے وہ آبِ زر سے لکھے جانے چاہئیں۔ فرماتے ہیں:۔

" اگر کسی آدمی کے لئے انفرادی طور پر عزت و وقار کی زندگی سے جی چرانا جائز ہو تو ہو، لیکن قوموں کے لئے سکون و آرام ان کی موت کے مترادف ہے۔ ان کا کام ہمیشہ آگے بڑھنا ہے۔ وہ جب کبھی اپنے مقصد کو پالیتی ہیں تو دوسرے مقاصد کو اپنا لیتی ہیں۔ ان کے ہاں ایک غایت کا حصول دوسری غایت کی تخلیق پر منتج ہوتا ہے کیونکہ یہی زندگی کا راز ہے۔ قناعت اور تواضع قوموں کی زندگی کے لئے زہرِ ہلاہل کا حکم رکھتے ہیں۔"

آپ کے تعلیمی نظریات آپ کی کتاب" مستقبل الثقافۃ فی مصر" اور" طٰہٰ حسین ودیمقراطیۃ التعلیم" میں دیکھا جا سکتا ہے۔

ڈاکٹر موصوف نے اسلامی تاریخ پر بھی قلم اٹھایا ہے، اس سلسلہ میں آپ نے "عثمان"، "علی" اور "الشیخان" کے نام سے کتابیں لکھیں۔ خلفائے راشدہ رضؓ سے متعلق یہ چاروں کتابیں بڑی قیمتی کتابیں ہیں، جہاں پر ہر خلیفہ راشد کے خدوخال، اخلاق و اطوار اور سیاسی و مذہبی بصیرت کو تاریخ کی روشنی میں دیکھا جا سکتا ہے۔ "عثمان" کے مقدمہ میں آپ نے خلافتِ راشدہ پر بحث کرتے ہوئے بتایا کہ وہ کن اصولوں پر قائم ہوئی تھی، اور مسلم معاشرے کی تشکیل و تعمیر کے لئے حضرت ابوبکرؓ اور حضرت عمرؓ نے کیا کچھ کیا۔ آپ نے اس سلسلہ میں بتایا کہ خدا کی وحدانیت اور کامل عدل و انصاف خلافتِ راشدہ کے بنیادی اصول تھے۔ اور خلافتِ راشدہ کا تجربہ انسانی تاریخ میں اپنی نوعیت کا انوکھا تجربہ تھا جو حالیہ وقت میں رائج مذہبی، جمہوری یا اشتراکی نظریات سے مختلف تھا۔ جن لوگوں نے حضرت عمرؓ کی شخصیت پر طٰہٰ حسین کی تقریر سنی ہے وہ جانتے ہیں کہ اعجازِ بیان کیا چیز ہے؟ ایک دفعہ قاہرہ میں "شبان المسلمین" کے ایک اجلاس کو خطاب کرتے ہوئے حضرت عمرؓ پر بول رہے تھے، تو مجھے یوں

محسوس ہو رہا تھا کہ طٰہٰ حسین کے سامنے ایک آسمانی کتاب دھری ہے اور فرشتوں کی انگلیاں اس کے ورق الٹ رہی ہیں۔

طٰہٰ حسین کو ابوالعلا معرّی سے گہری عقیدت ہے۔ لیکن جب معرّی نے خدا کی ذات کے بارے میں سنجیدگی سے شاعرانہ گستاخیاں کیں تو آپ نے ان کی گرفت کی، فرماتے ہیں:۔

"عقل پر کثرتِ اعتماد نے معرّی سے ایسی باتیں کہلوائی ہیں جو اسلام سے تعلق نہیں رکھتیں۔ مثلاً معرّی کا یہ کہنا کہ خدا کا تصوّر زمان و مکان کے بغیر کیونکر کیا جا سکتا ہے، خدا کو زمان و مکان کے تابع بناتا ہے، اور یہ ایک ایسی نادانی ہے جس کا مومن قائل نہیں۔" (مرءۃ الاسلام)

ہمارے زمانہ کے بعض مفسرین نے سورۃ الفیل میں "طیراً ابابیل" کی تشریح بیماری کے جراثیم سے کی ہے۔ عربی زبان سے ان حضرات کی ناآشنائی کا مذاق اڑانے کے بعد طٰہٰ حسین لکھتے ہیں:۔ "میرا خیال ہے کہ رسولِ کریمؐ اور صحابہ کرامؓ جراثیم سے واقف نہیں تھے۔ چنانچہ ان کے سامنے "طیراً ابابیل" کا وہ مفہوم قطعاً نہیں تھا، جو ان مفسرین کے ذہن میں ہے۔"

اس کتاب میں قرآن مجید سے متعلق فصل خاص طور پر پڑھنے کے قابل ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ طٰہٰ حسین کی شخصیت سے نہ صرف مصر کی نئی نسل متاثر ہوئی ہے بلکہ پوری عرب دنیا کی نئی نسل متاثر ہوئی ہے۔ آپ نے عرب نوجوانوں کی فکر و نظر کے سامنے نئی نئی راہیں کھولی ہیں۔ چنانچہ وہ اپنی ذات میں ایک فکر، ایک تحریک اور ایک جماعت تھے۔ آپ کی شخصیت میں، آپ کی ادبی و ثقافتی تخلیق میں ایک حسن ہے اور پاکیزگی، جس سے روح کو بالیدگی اور فکر و نظر کو زندگی ملتی ہے۔

آپ کی شخصیت نے جاں گسل مادی و معنوی مصائب کی چٹانیں چلنے کے بعد خوبی و کمال کی راہوں میں جو ارتقائی منزلیں طے کی ہیں انہیں دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ قطرہ کو گوہر بننے تک کن منزلوں سے گزرنا پڑا ہے۔